Rizwan Ullah
D-178, Abul Fazl Enclave-I
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel: 9971283786
Email:ruilmi@rediffmail.com
Web: www.Rizwanullah.com

ایک قومی زمینی پالیسی ضروری ہے

رضوان اللہ

دراصل ہندوستان میں کوئی قومی زمینی پالیسی یا ایسا کوئی نظام کبھی نہیں رہا، اس کی وجوہات ایک برصغیر کے برابر وسیع وعریض ملک کے متنوع جغرافیائی اور سیاسی حالات ہیں۔ سیاسی حالات کسی نہ کسی حد تک بہرحال جغرافیائی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ چنانچہ زمانۂ قدیم سے راجاؤں کی حکمرانی رہی، اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی راجہ کے حدودِ سلطنت میں ساری زمین اور اس کے اندر اور باہر جو کچھ تھا، سب راجہ کی ملکیت میں ہوا کرتا تھا اور اس دھرتی پر آباد لوگ اس کی پرجا ہوا کرتے تھے۔ مختلف زمانوں میں اور مختلف علاقوں میں حالات بدلتے رہے۔ اس طرح تاریخ کا یہ سفر ہمارے زمانے تک پہنچا۔ تاریخ کے اس سفر پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو موجودہ حالات کو اچھی طرح سمجھا جاسکے گا۔

راجاؤں مہاراجاؤں کی حکمرانی کے زمانے میں زمینیں ان کی ملکیت تھیں اور بس۔ تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا کہ اکبر کے وزیرِ مالیات راجہ ٹوڈرمل نے کوئی مستحکم اراضیاتی نظام قائم کرنے پر توجہ دی اور اس کے بنیادی اصول مرتب کیے جو مختصراً اس طرح تھے کہ زمین کاشت کار کی ملکیت میں ہوگی۔ زمین کی نوعیت اور اس پر کاشت کی جانے والی فصل کے اعتبار سے اس کی لگان متعین کی جائے گی جسے سرکاری عمال وصول کر کے سرکاری خزانے میں جمع کریں گے۔ گویا کاشتکار اور سرکار کے درمیان کوئی بچولیا نہ تھا۔ لگان کے تعین اور وصولی کے معاملے میں پوری دیانتداری برتنے کی حکام کو سخت ہدایت تھی۔ رشوت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سرکاری عملہ کی طرف سے کسی طرح کی زیادتی پر سخت تعزیر تھی۔ مختصر یہ کہ کاشتکاروں کو اپنی زمین سے براہِ راست فائدہ پہنچتا رہا۔ لیکن اکبر کی اس وسیع سلطنت کے ہر گوشے تک پہنچتے پہنچتے اس نظام کے محرک اور منتظم سب اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور آنے والے بادشاہوں اور راجاؤں نے اپنی اپنی من مانی کی اور اس کے حکام اور عمال نے بداعمالیوں کی راہ لی۔

ایسے میں بخششیں اور جاگیریں وجود میں آتی گئیں اور امراء ورؤساء اور جاگیرداروں کا ایک استحصالی طبقہ وجود میں آگیا جسے حکمراں کی خوشنودی کے علاوہ رعایا کی بہتری اور سہولتوں کی کوئی فکر نہیں تھی نہ اس سے کوئی سروکار۔ یہی کیفیت صدیوں کی منزلیں طے کرتے ہوئی برطانوی عہد سلطنت تک پہنچی۔ ظاہر ہے اس غیر ملکی حکومت کو شدید

مزاحمتوں کا سامنا تھا ایسے میں اس کو صرف اپنی بنیادیں مستحکم کرنے کے علاوہ اور کوئی فکر نہیں تھی۔ اسی ضرورت کے تحت زمینداروں، تعلق داروں، جاگیرداروں وغیرہ کا ایک بااثر طبقہ باقاعدہ وجود میں آ گیا اور نئے حکمرانوں نے ان درمیانی لوگوں کی معرفت حکمرانی کا طریقہ اختیار کیا۔ اس طرح حکومت اور رعایا کے درمیان کوئی براہِ راست رشتہ اور رابطہ نہیں رہ گیا۔ حکمرانوں کو رعایا کی فلاح سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مقامی حکام من مانی لگان وصول اور سرکاری خزانے میں جمع کرتے رہے۔ اس پر سے ان کی رشوت ستانی اور بداعمالیاں مستزاد تھیں جن پر کوئی گرفت نہیں تھی۔ یہی وہ حالات تھے جن میں انگریزوں کی حکمرانی کے خلاف بے چینی بڑھتی گئی اور بڑھتے بڑھتے آزادی کی تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ اس دور کے جن نوجوان ہندوستانیوں نے یورپ جا کر تعلیم حاصل کی وہ وہاں کے نظام اور نئے نئے سیاسی افکار سے متاثر ہوئے اور ہندوستان واپس آ کر یہاں ان تحریکات کو تازہ کرنے کے لیے فکرمند ہو گئے۔ کم وبیش وہی زمانہ انقلاب روس کا بھی تھا جس نے ان نئے سیاسی افکار سے سرشار ہندوستانیوں کو یقین دلا دیا کہ بادشاہتوں کو الٹنا ممکن ہے۔ انھوں نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کیا اور اس نعرے کے ساتھ آگے بڑھنے کے لیے پر تول ہی رہے تھے کہ یوروپ دوسری عالمی جنگ کی لپیٹ میں آ گیا جس کی لپٹیں ساری دنیا میں پھیلنے لگیں۔ ۱۹۴۵ء میں اس جنگ کے اختتام تک فاتح اقوام کی، جن میں برطانیہ بھی شامل تھا، چولیں ہل گئیں ان کے لیے اپنی نو آبادیوں پر قبضہ بنائے رکھنا ناممکن نظر آنے لگا چنانچہ وہ بھی کسی طرح گلا چھڑانے کی تدبیریں تلاش کرنے لگے۔ ایسے میں ہندوستانیوں نے ''ایک دھکا اور دو'' کے مطابق اپنی تحریک کو تیز کر دیا۔

لیکن اس وقت ملک کے حالات ایسے تھے کہ پانچ سال کی جنگ کے دوران ساری زرعی اور صنعتی کارروائیاں اور ساری پیداوار جنگ کی ضروریات کے مطابق اور ان کے لیے وقف تھیں چنانچہ ضروریات زندگی سے متعلق ساری چیزوں کی قلت اور راشنگ تھی، حتیٰ کہ نمک چینی، مٹی کا تیل، کپڑا تک نایاب تھا۔ کپڑا تو بلا پرمٹ کے ملتا ہی نہیں تھا۔ کفن کا کپڑا لینے کے لیے کسی کو مقامی تصدیق کے بعد ضلع یا تحصیل میں جا کر دن بھر دھکے کھانے پڑتے۔ کتنے ہی مردے چٹائی میں لپیٹ کر دریا میں ڈال دیے جاتے۔ ابھی ملک کے عوام اس عذاب سے جانبر بھی نہ ہوئے تھے کہ ملک کی آزادی کی تحریک ملک کی تقسیم پر منتج ہوئی۔ اس سلسلے میں جو غارتگری ہوئی اس کا کوئی حساب یا اندازہ کبھی نہیں کیا جا سکتا۔ شاید تاریخ انسانی میں سب سے بڑی ہجرت اسی وقت ہوئی۔ کروڑوں افراد ادھر سے ادھر ہو گئے۔ ایک عظیم تہذیب مٹ گئی۔ دو تین صدیوں میں دنیا نے جو انقلابات دیکھے تھے ان سب سے بڑا انقلاب یہی تھا۔ انقلاب زندہ باد کی یہ خونیں تعبیر تھی۔ چنانچہ تقریباً ایک عشرے کی مدت کے دوران کسی کو ارضیاتی یا صنعتی پالیسی وضع کرنے کا حواس ہی کہاں تھا۔ بس ایک عذاب تھا جس سے سارے لوگ کسی طور گزر رہے تھے۔

اس زمانے میں ایک بڑی قومی پارٹی کی حیثیت سے کانگریس نے ایک پالیسی ضرور اختیار کی اور اس کا اعلان کر دیا۔ وہ تھی تنسیخ زمینداری کی پالیسی لیکن اس کے بعد زمینوں کا کیا بندوبست ہوگا اس بارے میں کسی نے غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ آزادی کے بعد گوناگوں مہیب قومی مسائل نے اربابِ بست وکشاد کو ایسا آدبوچا کہ انھیں کوئی واضح راہ متعین کرنے کا حواس نہیں رہا۔ آئین میں سوشلسٹ طرز کی جمہوریت کے قیام کا اعلان تو کر دیا گیا

لیکن وہ طرز کیا تھا کبھی واضح نہیں ہوسکا۔

پنڈت نہرو جیسا روشن دماغ اور جہاندیدہ سیاستداں بھی یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ زراعت پر انحصار کرنے والا اتنا بڑا ملک اپنے نئے نظام کی بنیاد زراعت پر قائم کرے یا صنعتوں پر۔ دراصل یورپ کی صنعتی ترقی کی چکاچوند میں انھوں نے زراعت کو بالکل درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ ادھر گاندھی جی کی سودیشی کی پالیسی نے بھی ان کی ٹانگیں کھینچ رکھی تھیں۔ ایسے میں نہرو نے صرف صنعتوں کے قیام پر نہیں بلکہ بھاری صنعتوں کی ضرورت کو اولیں ترجیح دی۔ زمین اور اس کی پیداوار پر انحصار کرنے والی ستر فیصدی آبادی کے مسائل حکمراں اور قادر کل کانگریس پارٹی کی نظر سے اوجھل ہوگئے۔

آزاد ہندوستان کے نئے آئین کے نفاذ کے وقت ملک میں زمینی کیفیت کچھ اس طرح تھی۔ ملک کی دو نہیں تین ٹکڑوں میں تقسیم کے بعد شمالی ہند کے زبردست زراعتی خطے کا ایک بڑا حصہ خطِ تقسیم کی دوسری جانب چلا گیا، اس کے ساتھ ہی آبپاشی کا قدرتی دریائی نظام بھی مجروح ہوا۔ انگریزوں نے ملک کی حکمرانی سے دست بردار ہوتے ہوئے دیسی ریاستوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ نئے ہندوستان میں اپنے مقام اور مستقبل کا فیصلہ خود کریں۔ کئی سو چھوٹی بڑی ریاستوں میں زمین کا بہت بڑا رقبہ موجود تھا۔ وہ والیانِ ریاست کی ملکیت میں تھا اس لیے وہاں ان کی مرضی کے مطابق زمینوں کا جو نظام رائج تھا جاری رہا۔ ملک سے ہجرت کر جانے والے کروڑوں لوگوں کی اراضیاں اینی می پراپرٹی (enymy property) قرار دے کر سرکاری ادارے کسٹوڈین کی تحویل میں دے دی گئی۔ اس طرح کتنے ہی جائز وارثین اپنی جائدادوں سے محروم ہوگئے اور کتنے ہی غیر مستحق لوگ کسٹوڈین افسروں کی وساطت سے صاحبِ جائداد ہوگئے۔ زمینیں کوڑیوں کے مول نیلام ہوگئیں جن کا انتظام نئے مالکوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ تنسیخ زمینداری کا قانون صوبوں میں ایک ایک کر کے نافذ ہوتا جا رہا تھا جس میں یوپی سرِ فہرست تھا۔ اس قانون کے تحت اراضیات کی ملکیت کی حدیں معین کر دی گئی تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ان حدوں سے زیادہ زمین کسی شخص کی ملکیت میں نہیں رہ سکتی تھی۔ ظاہر ہے ان زمینوں کی ملکیت کا فیصلہ اور بندوبست سرکاری عمال کے ذمہ تھا۔ اصولاً انھیں بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ اس کارروائی سے بے زمین کسانوں کی غربت میں کتنا فرق آیا یہ تو نہیں معلوم لیکن بکثرت چھوٹے چھوٹے زمیندار قلاش ہوگئے کیونکہ بقیہ زمینیں ان کی معاش کے لیے ناکافی تھیں۔ ان سے حاصل کی ہوئی زمینوں کے لیے سرکار نے معمولی سا معاوضہ جو دینا طے کیا تھا وہ بھی نقد نہیں بلکہ طویل مدتی بانڈ کی صورت میں دیا گیا جو آئندہ کئی برسوں میں سالانہ قسطوں میں وصول ہوتے چنانچہ ان بدنصیب اور محروم زمینداروں کی اکثریت نے وہ بانڈ اونے پونے دام پر کاروباریوں کے ہاتھ بیچ دیے۔ اس طرح بے زمین غریبوں کی تعداد میں لاتعداد اضافہ ہوگیا۔ ان لوگوں کو نہ کسی صنعت و حرفت کا تجربہ تھا نہ پہلے سے انجام سے آگاہی تھی۔ بڑے بڑے زمینداروں نے پہلے ہی اپنی زمینوں کو کاروباری یا صنعتی اداروں کی شکل میں تبدیل کر لیا تھا۔

آزادی سے پہلے ہی کانگریس کی تنسیخ زمینداری کی پالیسی کے اعلان نے والیانِ ریاست کو چونکا دیا تھا، اس لیے ان میں سے جن کے لیے ممکن ہوسکتا تھا انھیں خطِ تقسیم کی دوسری جانب اپنا مستقبل محفوظ نظر آ رہا تھا اس لیے

ایسے تمام ریاستی حکمرانوں کے ذہنوں میں تقسیم کی تائید وحمایت کا تصور موجود تھا ان کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔

نئے آئین کے نفاذ کے چند برسوں بعد ہی یہ تصور شدید تر ہوتا گیا کہ زمینداری کے خاتمے کے بعد ریاستوں کی زمینی املاک کا برقرار رہنا غیر مناسب ہے اوران ریاستوں کے عوام کے ساتھ ناانصافی بھی ہے۔ چنانچہ دیسی ریاستوں کو اس بات کے لیے آمادہ کرلیا گیا کہ وہ ایک پرائیوی پرس کے عوض زمینی ملکیت کی معینہ حدوں سے زائد زمینوں کی ملکیت سے دست بردار ہوجائیں ورنہ انھیں قانون کے مطابق اس ملکیت سے محروم کردیا جائے گا۔ والیانِ ریاست کو چاروناچار اس پر راضی ہونا ہی پڑا لیکن جلد ہی وہ سالانہ پنشن جو پرائیوی پرس کے طور پر منظور کی گئی تھی، وہ بھی بے وقت اور عوامی مفاد کے خلاف نظر آنے لگی اور اس کا قصہ بھی ختم کردیا گیا۔ لیکن سابق رجواڑے اس انجام کے لیے تیار تھے وہ اپنی فاضل زمینوں کو بڑی حد تک دوسری تعمیرات اور صنعتوں کی صورت میں منتقل کرچکے تھے۔ جدید ترین فائیو اسٹار ہوٹل وغیرہ اسی صورت حال کی پیداوار ہیں۔ یہ سب تو ہوا لیکن آزادی کے دس بارہ سال بعد تک ایسا کوئی پلان یا پروگرام نہیں تھا، جس کے مطابق حاصل شدہ زمینوں کو بے زمینوں میں تقسیم کرنے کا کوئی قوی نظام ہوتا۔ حالانکہ ۱۹۵۶ء-۱۹۵۵ء میں ریاستوں کی نئی حد بندی کے لیے فضل علی کمیشن کی سفارشات کے نفاذ کے وقت یہ ایک اچھا موقع تھا لیکن نظام کی ریاست حیدرآباد کے حصے بخرے کرکے اور کچھ ترمیم وتنسیخ کرکے نئی ریاستیں بنادی گئیں۔ جغرافیائی اور موسمی حالات کے مطابق نئی ریاستوں کی تشکیل کا بھی یہی ایک اچھا موقع تھا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ روایتی طور پر جو لسانی ریاستیں موجود تھیں اسی طور پر ریاستوں کی تشکیل نو کی گئی جس کا سلسلہ ابتک جاری ہے۔ گویا پرانی روایتوں کو پکی قانونی حیثیت دے دی گئی۔

پلاننگ کمیشن کی تشکیل کے بعد اس نے اپنے پنج سالہ منصوبوں پر کام شروع کردیا تھا، فوڈ کارپوریشن اور اس جیسے دیگر قومی سطح پر کام کرنے والے ادارے وجود میں آتے جارہے تھے لیکن کسی کے دائرہ کار میں زمین کا مناسب نظام شامل نہیں تھا چونکہ ترقی کا تصور بھاری صنعتوں پر مبنی تھا اس لیے پلاننگ کمیشن یہی طے کرتا تھا کہ اگلے پنج سالہ منصوبے کے دوران کون سی صنعتیں قائم کی جائیں اور ان کے لیے کس قدر سرمایہ فراہم کیا جائے۔ اس کے بعد مرکزی اور ریاستی حکومتیں اسی کے مطابق اپنی کارروائیاں جاری رکھتیں۔ بھاری صنعتوں کے لیے وافر بجلی کی ضرورت تھی اس لیے پن بجلی کے کارخانوں کی ضرورت تھی اور ان کارخانوں کے لیے بڑے بڑے ڈیم ضروری تھے چنانچہ آسام سے پنجاب تک درجنوں ڈیم کا جال بچھ گیا۔ لیکن ہر ڈیم کی تعمیر میں سیکڑوں بستیاں غرق آب ہوگئیں، ہزارہا ہزار لوگ بے گھر اور بے زمین ہوگئے ان کے لیے کوئی مفید اور حسبِ ضرورت متبادل نہیں مہیا کیے گئے۔ کہنے کے لیے تو یہ بات تھی کہ ان ڈیموں سے پیدا ہونے والی بجلی سے مقامی صنعتوں کو فروغ ملے گا، آبپاشی کے لیے وافر پانی ہمیشہ موجود رہے گا لیکن یہ عجیب منطق تھی کہ جب آبادیاں نہیں رہیں لوگ مہاجرت کرگئے تو مقامی صنعتیں کہاں پھیلتیں اور جب زراعتی زمینیں ڈوب گئیں تو آبپاشی کہاں ہوتی۔ اس صورت حال کے نتیجے میں چپکو جیسی مزاحمتی تحریکیں چل پڑیں۔

فوڈ کارپوریشن کو زمینوں اور ان کی پیداوار سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس کا کام تھا کاشتکاروں سے ان کی پیداوار کو سرکاری نرخ پر خریدنا اور ہر علاقے کی ضرورت کے مطابق اناج کی تقسیم پر۔ اس کے لیے بڑے بڑے گودام تو تعمیر کیے گئے لیکن مشاہدہ بتاتا ہے کہ یہ سارا نظام بالکل ناکافی تھا۔ سائنس دانوں کی کاوشوں سے نئی نئی فصلیں دریافت کی گئیں، پیداوار بڑھانے کے لیے نئی نئی تکنیک اختیار کی گئی جس کے نتیجے میں سبز انقلاب کی آمد کا اعلان کر دیا گیا لیکن ان تدبیروں سے اور کسانوں کی کاوشوں سے جو وافر پیداوار ہوئی ان کے لیے گودام ناکافی ہو گئے۔ کھلے آسمانوں کے نیچے اناج کے ذخیرے سڑتے رہے۔ کسانوں کو اپنی کاشتکاری کی لاگت کے مطابق دام نہیں ملے۔ نتیجہ ظاہر ہے کسان اپنے کھیتوں میں کھڑی فصلوں کو آگ لگانے لگے۔ وہ اقبالؔ کے اس مشورے پر غیر ارادی طور پر عمل کر رہے تھے:

''جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو''

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہر سال لاکھ کے حساب سے کسان خودکشی کرنے لگے۔

علاؤالدین خلجی کی مثال بھی ہمارے سامنے موجود ہے جس نے نہ زمینوں کا کوئی بندوبست کیا نہ فصلوں کا لیکن بازار پر سختی سے کنٹرول کیا۔ ہر چیز کا نرخ مقرر کر دیا گیا۔ اس کی خلاف ورزی کرنے یا کم تولنے پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس طرح کاشتکاروں اور خریدار کے درمیانی لوگوں کو نفع کما کر کاشتکاروں کو ان کی منفعت سے محرومی کا موقع نہیں تھا۔ پیداوار بڑھانے اور بازار میں لانے پر کاشتکاروں کی اس طرح حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ زیادہ نرخ پر بیچنے کے لیے ذخیرہ اندوزی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ آج دنیا کے حالات اتنے پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ اس قدر سختیاں ممکن نہیں پھر بھی ذخیرہ اندوزی وغیرہ کے خلاف سخت کارروائیاں کر کے کسی قدر اصلاح کی جا سکتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس طرح کا ہر اقدام کرپشن کی نئی نئی صورتوں کو جنم دیتا ہے۔

ہندوستان جیسے زرعی اور زراعت کے لیے درکار قدرتی وسائل کی دستیابی والے ملک میں ترقی کے تصور کی بنیاد بھاری صنعتوں پر رکھی گئی۔ بلاشبہ ملک میں معدنی وسائل وافر تھے کوئلہ، فولاد، پانی سب دستیاب تھا لیکن ان کو مصرف میں لانے کے لیے بڑے پیمانے پر کانکنی اور کارخانوں کی تعمیر درکار تھی اس کے لیے بھی زمینیں بلا روک ٹوک حاصل کی گئیں جو لوگ ان قدرتی وسائل کے مالک تھے یا ان سے فائدہ اٹھا رہے تھے ان کی دربدری کا کوئی مداوا نہیں کیا گیا۔ انہی اجڑے ہوئے لوگوں نے اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر بندوق اٹھالی ہے۔ اس کا جواب طاقت سے دینے کے بجائے ان کے درد کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دستیاب فاضل زمینوں کو بے زمینوں میں تقسیم کرنے کا قومی سطح پر کبھی کوئی منصوبہ نہیں رہا۔ ۷۰-۱۹۶۰ء کے عشروں میں اچاریہ ونوبا بھاوے نے بھودان کی تحریک شروع کی۔ انھوں نے فاضل زمینیں رکھنے والوں سے زمین دان کرنے کی اپیل کی۔ اس کا کچھ اثر بھی ہوا اس طرح دستیاب لاکھوں ایکڑ زمین کو بھودان ورکروں نے تقسیم بھی کیا لیکن اتنا بڑا اور پیچیدہ کام جس میں دستاویزات وغیرہ مرتب کرنا ضروری ہوتا ہے بلا کسی مستحکم سرکاری ڈھانچے کے

چلانا کسی غیر سرکاری ڈھیلی ڈھالی تحریک کے لیے ممکن نہیں تھا چنانچہ محرومیوں، نا آسودگیوں وغیرہ کی آندھی میں وہ تحریک بھی گم ہوگئی۔

اب نئی حکومت نے پلاننگ کمیشن کو قصہ پارینہ بنادیا ہے اور ملک کی ترقی کے نعرے کے ساتھ نظامِ مملکت سنبھالا ہے تو یہ ایک اچھا موقع ہے کہ زمینوں کے معقول استعمال کی پالیسی اور اس کے مطابق تدبیریں اختیار کرے۔ مناسب ہوگا کہ اس کے لیے الیکشن کمیشن کی طرح کوئی مستقل با اختیار کمیشن قائم کیا جائے جو ہر خطے کی زمینوں کے استعمال کی منصوبہ بندی کرے۔ موسمی حالات پر مستقلاً نظر رکھے، انہی حالات کے مطابق فصلوں کا تعین کرے۔ قدرتی آفات کے نتیجے میں فصلوں کو ہونے والے نقصانات کے لیے سرکاری معاوضہ کا تعین کرے جو بے ایمان بیچولیوں اور بداعمال سرکاری عمال کی جیب میں جانے کے بجائے متاثرین تک پہنچے۔ اس طرح کے اقدامات سے ملک کی ترقی یقینی ہے۔ عوام کی بے چینی میں کمی سے امن اور خوشحالی کو فروغ ملے گا۔

حکومت اگر چانٹر کیہ کے سیاسی فلسفے پر عمل کرے تو لازم ہے کہ راجہ ٹوڈرمل کے زمینی فلسفے پر بھی عمل کرے۔ اب وزیرِ اعظم نے تحویلِ اراضی کے ترمیمی بل کی حرارت کو کم کرنے کی راہ اختیار کی ہے تو یہ ایک اچھا موقع ہے کہ ساری پارٹیوں کے لیڈروں کی ایک میٹنگ میں ایک زمینی قومی کمیشن قائم کرنے کی تجویز پر غور کیا جائے اور اس کمیشن کو بالکل خودمختار اور سیاسی اثرات سے پاک رکھا جائے۔ شاید اس تدبیر سے اس دھرتی کی اور اس کے باسیوں کی تقدیر بدل جائے۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ دنیا خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے غذائی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔

امریکہ میں منتخب عہدے

اگرچہ امریکہ میں واحد وفاقی حکومت ہے لیکن اس میں حسبِ ذیل شامل ہیں

۵۰ ریاستی حکومتیں

۳ لاکھ سے زیادہ عہدے مقامی حکومتوں کے (کاؤنٹی، سٹی اور ٹاؤن کی)

اور تقریباً ۲ لاکھ مخصوص مقاصد کے اضلاع جیسے کہ اسکولی اضلاح، پانی کے اضلاع، نتیجے کے طور پر امریکی ووٹروں کو صرف صدر اور کانگریس (پارلیمنٹ) کے لیے نہیں ووٹ دینا ہوتا ہے بلکہ ریاستی اور مقامی حکومت کے ہزاروں عہدیداروں کے لیے بھی ووٹ دینا ہوتا ہے جن میں ریاستی قانون ساز ممبر، ریاستی گورنر اور لیفٹیننٹ گورنر، ریاستی آڈیٹر، کاؤنٹی کمشنر، ٹاؤن اور سٹی میئر، ایلڈرمین، جج، کانسٹبل، مجسٹریٹ، شریف، جسٹس آف پیس اور اسکول بورڈ، کالج بورڈ، یوٹیلٹی بورڈ کے ممبران اور عوامی ٹرسٹ کے عہدیدار شامل ہیں۔

کچھ غیر معمولی قسم کے منتخب عہدے بھی ہیں جیسے کاؤنٹی کورونر، آبپاشی اضلاع اور ٹاؤن سمٹری کمیشنوں کے ممبر اور درختوں کے وارڈن یعنی وہ افسران جو شہری املاک پر مخدوش درختوں کو ہٹانے کی نگرانی کرتے ہیں۔